مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

قرآن نافہمی کے اسباب اور اس کا حل

قرآنِ کریم عربی زبان میں نازل ہوا۔ اور دنیا میں شاید عربی ہی ایک ایسی زبان ہے جو ترجمہ کے بغیر پڑھائی جاتی ہے۔ بچہ جب پہلی جماعت سے انگریزی پڑھنا شروع کرتا ہے تو استاد اسے بتلاتا ہے A سے "APPLE" "APPLE" بمعنی "سیب"۔ اسی طرح فارسی پڑھنے والے بچے کو صرف "آب" اور "است" ہی نہیں پڑھایا جاتا بلکہ یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ "آپ" کے معنی "پانی" اور "است" کے معنی "ہے" ہوتا ہے۔ لیکن جو بچے عربی پڑھتے ہیں، انہیں صرف الفاظ ہی پڑھائے جاتے ہیں۔ الفاظ کے معانی کا خیال کسی کو بھولے سے بھی نہیں آتا۔

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہمیں یہ بات ذہن نشین کرا دی گئی ہے کہ قرآنِ کریم کا ناظرہ پڑھنا ہی باعثِ برکت ہے۔ دلیل کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کیا جاتا ہے:

"قرآنِ کریم کے ہر حرف کے بدلے ایک نیکی ملتی ہے۔ اور ہر نیکی کا دس گنا اجر ملے گا۔ میں نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے۔ بلکہ الف ایک حرف ہے، "ل" الگ حرف ہے۔ اور "م" الگ حرف!" (ترمذی)

اس سے ہم عامیوں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر قرآنِ کریم کو ناظرہ پڑھنے سے ہی اتنی زیادہ نیکیاں مل جاتی ہیں تو پھر ترجمہ پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟

اسی طرح رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس ارشادِ مبارک:

"خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ" (متفق علیہ)

"تم میں سے بہتر وہ ہے جو خود قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھلائے"

سے بھی ہم نے یہی سمجھ لیا کہ بس قرآنِ کریم ناظرہ پڑھنے پڑھانے سے ہی آپؐ کے ارشاد کی کما حقہٗ تعمیل ہو گئی۔

لیکن معاملہ یوں نہ تھا جو ہم غلطی سے سمجھ بیٹھے۔ قرآنِ کریم جو عربی میں نازل ہوا ہے، صرف اہلِ عرب کیلئے نہیں، پوری دنیائے انسانیت کیلئے نازل ہوا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں، خواہ عربی ہوں یا عجمی، قرآن کریم پڑھنے کا زیادہ سے زیادہ شوق اور اس کی رغبت پیدا ہو۔ اور اہلِ عجم محض اس خیال سے، کہ ابھی وہ قرآنِ کریم کے معانی و مطالب نہیں سمجھتے، قرآنِ کریم کی تلاوت سے بھی غافل نہ ہو جائیں۔ چنانچہ اس ناظرہ پڑھنے کی ترغیب کا یہ فائدہ ہوا کہ ان مسلمانوں کے دلوں میں قرآنِ کریم کے معانی و مطالب بھی جلد از جلد سیکھنے کی تڑپ پیدا ہوئی اور انہوں نے نہ صرف دینی تعلیم کے حصول کیلئے طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کیں بلکہ آنے والی نسلوں کیلئے شریعت کے ہر ہر پہلو پر ایسا قیمتی ذخیرہ بھی کتابوں کے اوراق میں محفوظ کر دیا کہ ان کے اس احسان سے ہم شاید کبھی بھی سبک دوش نہ ہو سکیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک جامع تھا، اسلاف نے اس کی حقیقت کو پہچان لیا اور اس پر عمل کر کے دکھلا دیا۔ لیکن ہم اس کی تہ تک نہ پہنچ سکے اور نتیجۃً قرآنِ کریم کی تعلیمات سے دور ہٹتے چلے گئے۔

اگر بات صرف یہیں تک محدود رہتی تو بھی مسلمانوں میں ہمہ پہلو انحطاط رونما نہ ہوتا، علمائے حق، عوامی جہالت کے اس خلا کو ملکی زبان میں تبلیغ کے ذریعہ پُر کر سکتے تھے، لیکن ستم تو یہ ہے کہ اس قرآن نافہمی کے اور بھی بہت سے اسباب پیدا ہو گئے۔ اور یہ ایک دلخراش حقیقت ہے کہ یہ اسباب ان لوگوں کے پیدا کردہ ہیں جنہیں ہم دینِ اسلام کی بزرگ ہستیاں سمجھتے ہیں۔ آج ہم انہی اسباب کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

پہلا سبب، قرآنِ کریم کو مشکل ترین کتاب سمجھ لینا:

قرآنِ مجید میں ہے:

"ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر"

"اور ہم نے قرآنِ مجید کو سمجھنے کیلئے آسان کر دیا ہے، تو کوئی ہے کہ سوچے اور سمجھے؟"

لیکن ہمیں یہ بات باور کرا دی گئی ہے کہ قرآنِ کریم ایک مشکل ترین کتاب ہے اور اس کو سمجھنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ لہٰذا عوام الناس کیلئے یہی بہتر ہے کہ وہ کسی عالمِ دین کی اتباع اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ نے تو قرآن عام لوگوں کیلئے اتارا اور سہل زبان میں نازل کیا تھا لیکن اس ارشاد کے علی الرغم قرآنِ کریم کو عوام کے ذہن سے بالاتر اور مشکل ترین کتاب قرار دے دیا گیا۔ اور اس کا ثبوت آپ کو دینی مدارس میں مروجہ نصاب سے مل جائیگا۔ آپ کسی بھی دینی مدرسہ کے نصابِ تعلیم پر نظر ڈالئے، آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم پڑھنے پڑھانے کی نوبت سب سے آخری سال آتی ہے۔ اگر کسی مدرسہ کا نصابِ تعلیم ۶ سال

ہے تو تفسیر و قرآن چھٹے سال، اور اگر ۹ سال کا ہے تو نویں سال پڑھایا جاتا ہے۔ پہلے سالوں میں علی الترتیب صرف، نحو، منطق، ادب اور فقہ وغیرہ پڑھائے جاتے ہیں۔ اختتامی سال سے ایک سال قبل کو دورۂ حدیث اور آخری سال کو قرآنِ کریم کی تعلیم کے لئے مختص کیا جاتا ہے۔ ایسے مجوزہ نصابِ تعلیم کی مصلحت خواہ کچھ بھی ہو، ایک عام آدمی یہی تاثر لیتا ہے کہ قرآنِ کریم شاید ان تمام کتابوں سے مشکل ترین کتاب ہے۔ جبھی تو اس کی نوبت سب سے آخر میں آتی ہے۔

تقلیدِ جامد:

قرآنِ کریم کو سب سے آخر میں پڑھانے کی جو مصلحت بیان کی جاتی ہے اس سے یکسر انکار کرنا مشکل ہے لیکن تکلیف دہ امر یہ ہے کہ حقیقتاً جس مصلحت کیلئے قرآنِ کریم کو آخر میں ڈالا گیا، وہ کچھ اور ہے۔ اور اسے پردۂ راز میں رکھا جاتا ہے۔ یہ مقصد عقیدۂ تقلید کی حفاظت، ہے۔ مقلدین کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ قرآن و سنت کو اپنے امام کی فقہ کی عینک سے دیکھا جائے۔ پہلے مبتدی کو فقہ کی تمام متعلقہ کتب پڑھا لی جاتی ہیں اور جب اس کے ذہن پر فقہ کی چھاپ لگ جاتی ہے تو وہ قرآن و سنت سے نتائج اخذ کرنے میں وہی روش اختیار کرتا ہے جو اس کے نصابِ تعلیم کی ترتیب کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے امام سے ہٹ کر کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہتا اور اگر کہیں اسے الجھاؤ یا تضاد نظر آتا بھی ہے تو وہ اس کی تحقیق کی ذمہ داری اپنے امام کے سر ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ تقلید کی تعریف ہی یہ کی جاتی ہے:

"والتقلید قبول قول غیر بلا دلیل فکانہ جعلہ قلادۃ فی عنقہ" (شرح قصیدہ امالی از ملا علی قاری حنفی)

اس تعریف سے واضح ہے کہ مقلدین ذہنی طور پر اپنے امام کو امام نہیں بلکہ پیغمبر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ پیغمبر ہی ایک ایسی ہستی ہو سکتی ہے جس کی بات بلا دلیل قبول کی جائے۔ پیغمبر کے علاوہ کوئی اور ہستی معصوم اور مبرا عن الخطا نہیں ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ جس تحقیق کی ذمہ داری امام کے سر ڈالی جاتی ہے، وہ خود اس ذمہ داری کو قبول کرنے کیلئے قطعاً تیار نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں زیادہ تر حنفی مذہب ہی رائج ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے تھے کہ: "جب صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے!"

بلکہ آپ نے یہاں تک کہہ دیا:

کہ "اگر حدیث مل جائے تو میرے قول کو دیوار پر دے مارو!"

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کے معروف شاگردوں امام محمد اور امام زُفر نے بہت سے مسائل میں آپ سے اختلاف کیا۔ لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ امام موصوف کے ان اقوال کے علی الرغم، ان کے مقلدین حدیث کی دور از کار تاویلات میں مشغول ہو جاتے ہیں یا اس کی ذمہ داری امام کے سر ڈال کر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن اپنے امام کے قول کو چھوڑنا انہیں قطعاً گوارا نہیں ہوتا۔

اگر فقہ سے پہلے قرآن وحدیث پڑھایا جائے تو مبتدی کے ذہن پر پہلی چھاپ قرآن وحدیث کی ہوگی۔ مسائل کے حل واستنباط میں وہ فقہ سے مدد تو لے گا لیکن عملاً مقلد نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا تقلید کے اس "کاز" کیلئے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ قرآنِ مجید کی تعلیم سب سے آخر میں رکھی جائے۔

فقہ کی تدوین کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں مسائل حاضرہ کا قیاس اور اجتہاد کے ذریعہ صحیح حل تلاش کیا جائے۔ ائمہ فقہاء نے اسی مقصد کے پیشِ نظر اپنے دور میں فقہ کی تدوین کی۔ اور اس دور کے مسلمانوں نے بھی یہی کچھ سمجھا۔ لیکن بعد کے مسلمانوں نے آئندہ اجتہاد کو شجرِ ممنوعہ قرار دیکر ہر چہار ائمہ فقہاء میں سے کسی ایک کی اتباع کو اسلام کا جزو بنا دیا —— پانچویں صدی ہجری میں یہ عقیدہ اتنا راسخ ہو گیا تھا کہ جو شخص کسی مخصوص امام کا مقلد نہ ہوتا، اسے بطور گالی یہ کہا جاتا تھا کہ وہ چاروں مذاہب سے باہر ہے۔ بالفاظِ دگر اس کا اسلام ہی مشکوک ہے۔

اس جامد تقلید نے مسلمانوں کے حواس معطل کر دئیے۔ قرآن وحدیث کو پڑھنے پڑھانے اور اس میں غور وفکر کی ضرورت ہی کو ختم کر دیا گیا تو اس کی صلاحیت کہاں باقی رہتی؟ —— اس صورتِ حال کا نقشہ پروفیسر محمد سلیمان اظہر بحوالہ تاریخ فرشتہ[1] سیرت محمد بن عبدالوہاب میں یوں کھینچتے ہیں:

"عربی سے صرف چند لوگ ہی آشنا تھے اور انہوں نے جاہل عوام کو بھیڑوں کا گلہ بنائے رکھنے کے لئے عربی میں موجود اسلامی علوم پر اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ ملکی زبان میں کتاب وسنت کے نہ تراجم تھے نہ شروحات، لوگ کبھی کبھی قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے تھے۔ لیکن اس میں کیا لکھا ہے، اس سے سراسر ناآشنا تھے۔ تقلید وجمود کی بندش اس قدر مضبوط ہو چکی تھی کہ ایک مناظرہ میں خواجہ نظام الدین اولیا نے جب اپنی تائید میں ایک روایت بطور استدلال پیش کی تو ہندوستان کے سب سے بڑے فقیہ خواجہ رکن الدین صاحب نے کہا کہ:

"میں بھی مقلد ہوں اور آپ بھی مقلد ہیں، اس لئے حدیث کی کیا ضرورت ہے؟ امام ابوحنیفہ کا قول پیش فرمائیے!"

ظاہر ہے کہ ایسا عقیدہ قرآن وسنت کے یکسر منافی ہے۔ صحابہ اور تابعین آخر کس امام کے مقلد تھے؟

(۱ے حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

جبکہ فقہ کی تدوین ہی بہت بعد میں ہوئی۔ نیز آیت "الیوم اکملت لکم دینکم" کے مصداق دین کی تکمیل بہت پہلے ہو چکی تھی اور اسلام مکمل صورت میں موجود تھا۔

بایں ہمہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے تاقیامت اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے لہٰذا تاریک سے تاریک دور میں بھی علمائے حقہ کی ایک جماعت رہی، خواہ وہ کتنی ہی قلیل ہو، قرآن و سنت کو سینہ سے لگائے رکھا اور باطل سے برسرِ پیکار رہی۔ یہ جماعت اہل سنت کہلوائی۔ لیکن جب مخالف فرقوں نے بعض سیاسی اغراض کی بنا پر انہیں "وہابی" کی مذہبی گالی سے نوازنا شروع کیا تو انہوں نے اہل حدیث کہلوانا گوارا کر لیا۔ یہ جماعت دینی مدارس میں رائج درسِ نظامی[1] کی اس "مصلحت" سے خوب واقف تھی لہٰذا اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہی۔ جناب حافظ نذر محمد صاحب پرنسپل شبلی کالج لاہور اپنی تصنیف "مدارسِ عربیہ کا جائزہ" میں "درسِ نظامی میں اصلاحات کی تجاویز" کے تحت یوں رقمطراز ہیں:

"درسِ نظامی پر بیرونی حلقوں سے مسلسل یہ اعتراض رہا ہے کہ مدارس اہلحدیث کے علاوہ باقی تمام مدارس میں قرآن و حدیث کو صرف آخری سالوں میں سبقاً سبقاً پڑھایا جاتا ہے۔ حالانکہ دین کے یہی اصل الاصول ہیں۔ کسی نہ کسی نہج پر ان کا مطالعہ ابتدا سے شروع ہونا چاہیئے۔"

دوسرا سبب، پیرانِ عظام کے مخصوص نظریات:

(ا) ولایت کا معیار:

اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ ہندوستان میں اسلام زیادہ تر صوفیائے کرام کے توسط سے ہی پھیلا۔ یہ لوگ خود عموماً عالم باعمل تھے۔ لیکن بعد میں آنے والے جانشین قرآن و سنت کی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے چلے گئے، اور اس کی وجہ غالباً وہی ہے جو پہلے ذکر کی جا چکی ہے۔ ولایت کا معیار کرامات اور خوارق عادات واقعات قرار پا گئے اور یہی اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ کرامات کے ظہور کیلئے دیندار اور متقی ہونا تو کجا، مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں

حاشیہ صفحہ گزشتہ: محمد قاسم فرشتہ مؤرخ، متوفی ۱۰۲۱ھ

[1] یہ نصاب آج سے تقریباً اڑھائی سو سال پیشتر سے دینی مدارس میں رائج ہے۔ مولوی نظام الدین (متوفی ۱۱۶۱ھ) نے اسے مرتب کیا تھا۔

کیونکہ ہندوؤں کے جوگیوں اور سادھوؤں سے بھی ایسی کرامات اور خوارق عادات واقعات کا ظہور اکثر تذکروں میں موجود ہے۔ یہی ہندوانہ تاثر مسلمانوں نے بھی اپنایا اور ساتھ ہی ساتھ یہ آیت بھی چسپاں کر دی:

"ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون"

لیکن علمی فقدان کی وجہ سے یہ خیال کسی کو بھی نہ آتا تھا کہ قرآنِ کریم جن لوگوں کو "اولیاء" کہتا ہے ان کے اوصاف کیا ہیں؟ کیا وہ اولیاء یہی لوگ ہیں، جو خوارق عادات و واقعات کے حصول کیلئے قبروں پر مراقبے کرتے اور مختلف قسم کی چلہ کشی کو اپنا شعار بناتے ہیں؟ شریعت میں تو سرے سے مزاروں کا وجود، مراقبے اور چلہ کشی ہی ممنوع ہے۔ تو پھر یہ لوگ اولیاء کیسے ہو گئے؟ اس کے برعکس قرآن مجید ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دوست قرار دیتا ہے جو مومن، متبع شریعت ہوں، اتقاء کے درجے پر ہوں۔ آیت مذکورہ بالا سے اگلی آیت یوں ہے:

"الذین آمنوا وکانوا یتقون"

شریعت، طریقت اور معرفت کا عقیدہ:

اس مشکل سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ یہی تھا کہ مریدوں کو قرآن کی تعلیم سے بے بہرہ رکھا جائے۔ چنانچہ مریدوں کو یہ ذہن نشین کرایا گیا کہ شریعت جو قرآن و حدیث میں مذکور ہے، یہ محض ابتدائی اور سطحی درجہ ہے۔ اس سے اگلی سٹیج "حقیقت" اور سب سے اعلیٰ درجہ "معرفت" ہے۔ اور یہ بھی باور کرا دیا گیا کہ پیرانِ عظام طریقت کے بلند تر مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ لہٰذا انہیں شریعت کی حدود و قیود سے پرکھنا قطعاً درست نہیں ہے۔ یہ لوگ صاحبِ حال ہوتے ہیں لہٰذا ان کے اعمال و کردار کا ظاہری شریعت کے احکام سے تقابل ان کی شان کے خلاف ہے۔ حتیٰ کہ اگر یہ پیرانِ باصفا کسی ایسی بات کا حکم دیں جو شریعت کے سراسر خلاف نظر آتی ہو تو بھی مرید پر لازم ہے کہ وہ بلا چون و چرا ان کی اطاعت کرتا چلا جائے۔ صرف اسی صورت میں وہ سلوک کی منازل طے کر سکتا ہے۔ حافظ سعدی شیرازی متوفی ۶۹۱ھ نے انہی افکار و نظریات کو اپنے درج ذیل شعر میں قلمبند کیا ہے ؎

مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود از راہ و رسم منزل ہا

ترجمہ: اگر تجھے بزرگ پیر اپنے مصلیٰ کو شراب میں رنگین کرنے کا حکم دے تو ضرور ایسا کر کہ سالک سلوک کی

منزلوں کے آداب و مراسم سے ناواقف نہیں ہوتا۔

ظاہر ہے کہ قرآن و سنت میں ایسی خرافات کی کوئی گنجائش نہیں لہٰذا اگر قرآنِ مجید کی تعلیم عام ہو جائے تو ان کے کاروبار پر کاری ضرب پڑتی ہے۔ لہٰذا ان لوگوں نے عمداً یہ وطیرہ اختیار کیا کہ اپنے مریدوں کو قرآنی تعلیمات سے بے خبر رکھیں اور انہیں غفلت کی نیند سویا رہنے دیں۔

غوث، قطب، ابدال:

یہ بات اس سے بھی آگے بڑھتی گئی۔ اور یہ چیز بھی عقیدہ میں شامل کر دی گئی کہ اس دنیا میں ہر وقت ۳۱۳ نجیب موجود رہتے ہیں۔ پھر ان میں سے ۷۰ نقیب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۴۰ ابدال ہوتے ہیں۔ پھر ان میں سے ۷ قطب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۴ اوتاد اور پھر ان میں سے صرف ایک غوث کا اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے جو ہمیشہ مکہ مکرمہ میں رہتا ہے۔ جب بھی اہلِ زمین پر کوئی ارضی یا سماوی آفت نازل ہوتی ہے تو وہ نجباء کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ نجیب یہ درخواستیں نقیبوں کو پیش کرتے ہیں اور بالآخر یہ درخواست بہ ترتیب و حفظِ مراتب ... (THROUGH PROPER CHENNEL) غوث تک پہنچتی ہے جس کا علم اللہ کے علم کے برابر ہوتا ہے اور اس کی قدرت اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کم نہیں ہوتی اور وہ ان مصائب کو دور کر دیتا ہے۔ العیاذ باللہ!

یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ان عقائد نے کہاں سے راہ پائی اور ان خرافات کے ماخذ کیا ہیں۔ قرآن و حدیث اور کتبِ سیر میں ان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ امام حسنؓ کو غوثِ اوّل کہا جاتا ہے تو آخر تاریخ و سیر کی کتب کیوں خاموش ہیں؟ پھر ان کی اقامت مکہ مکرمہ میں نہ تھی۔ پیر عبدالقادر جیلانیؒ جو غیاث المستغیثین یا سب سے بڑے غوث سمجھے جاتے ہیں۔ ساری زندگی بغداد میں رہے۔ ان کا مولد و مدفن بھی یہی جگہ ہے۔ تو پھر جب وہ غوث کی شرائط ہی پوری نہیں کرتے تو غوث کیونکر ہو گئے؟ ان مذکورہ دو غوثوں کے علاوہ آج تک کون کون سے غوث پیدا ہوئے اور آجکل مکہ مکرمہ میں کون صاحب غوث کے مقام پر فائز ہیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کا جواب ان لوگوں کے پاس بھی نہیں ہے ——— اگر قرآن و سنت کی تعلیم عام ہو جائے تو ریت کے تودہ پر تعمیر شدہ یہ عمارت دھڑام سے زمین پر آگرتی ہے۔ لہٰذا ان غلط عقاید کا تحفظ اسی بات میں تھا کہ عوام کالانعام کو قرآن و سنت کی تعلیمات کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا جائے۔

مزارات اور آستانوں کا وجود :

اس کا ایک اور پہلو مزاروں اور آستانوں کا وجود بھی ہے جو قرآنی تعلیمات عام ہونے کی صورت میں یقیناً خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ اگر آپ کو کسی مزار یا آستانے پر جانے کا اتفاق ہو تو آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ وہاں مشرکانہ رسوم کس کس طور پر ادا کی جاتی ہیں، عقیدۃً لوگوں کو کیونکر گمراہ کیا جاتا ہے؟ ایسے لوگ جنہوں نے عمر بھر کبھی نماز ادا نہ کی ہو، ساتویں دن دربار کی حاضری کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟ شفاعت، نجات اور جنت کے سرٹیفکیٹ کہاں کہاں سے ملتے ہیں اور یہ عطا کنندگان کون اور کیسے لوگ ہیں؟ بے دین اور بدکار مجاوروں کو فحاشی اور بدکاری کے کیسے کیسے مواقع میسر آتے ہیں ـــــ بھنگ اور چرس کا دور کیسے چلتا رہتا ہے؟

اب آپ خود ہی غور فرمائیے کہ شریعتِ مطہرہ میں ایسی باتوں کی گنجائش کہاں ہے؟ ظاہر ہے اگر مریدانِ باصفا، کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرا دیا جائے تو اس مکروہ کاروبار کا وجود خطرے میں پڑ جائیگا۔ لہٰذا اس طبقہ نے اپنی بقا اور عافیت اسی میں سمجھی کہ عوام کو قرآنی تعلیمات سے بے بہرہ ہی رکھا جائے ـــــ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری!

رمضان ۸ھ میں جب مکہ فتح ہو گیا اور عرب کا بیشتر علاقہ اسلامی اقتدار کے زیرنگیں آ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسی ماہِ مبارک میں جہاں عزیٰ، سواع، اور منات کے بتوں کو پاش پاش کرنے کیلئے علی الترتیب حضرت خالدؓ بن ولید، حضرت عمروؓ بن العاصؓ اور حضرت سعید بن زیدؓ کی قیادت میں سرایا روانہ کئے وہاں حضرت علیؓ کی قیادت میں ایک وفد اس غرض سے بھی بھیجا کہ مزارات کو منہدم کر دیا جائے اور جو قبریں زمین سے ایک بالشت سے زیادہ اونچی ہوں خواہ پختہ ہوں یا کچی، انہیں زمین کے برابر کر دیا جائے۔

اس کے برعکس ہندوستان میں بہت سے ہندو، صوفیائے کرام کے توسط سے مسلمان ہوئے۔ جن کے ہاں ایسے لاتعداد آستانے پہلے سے موجود تھے۔ اور چونکہ شرعی تعلیم کی طرف پوری توجہ نہ دی گئی لہٰذا ان نومسلموں کے اعتقادات اور افکار و نظریات میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہ ہو سکی ـــــ اور رونما بھی کیونکر ہوتی۔ پہلے وہ مندروں میں بتوں کے سامنے سربسجود تھے تو اب مزارات ان کیلئے سجدہ گاہ بن گئے تھے۔ پہلے دیوتاؤں کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جاتا تھا، اب صوفیا اور پیروں نے ان کی جگہ لے لی جن سے وہ مرادیں مانگنے لگے۔ ان حالات میں اسلام کی پابندیاں اور اعمالِ حسنہ کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی تھی۔ لہٰذا وہ روحانی مدارج، شرکیہ وظائف، قبروں پر چلہ کشی،

اور مرشد کی توجہ کے محتاج ہو کر رہ گئے۔ اس ظلمت کدہ میں شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی متوفی ۱۰۳۴ھ) نے حق کی آواز بلند کی اور ان مشرکانہ افکار و نظریات پر کاری ضرب لگائی۔ ان کی بھرپور کوششوں سے یہ فتنہ کسی حد تک دب گیا۔ لیکن چونکہ قرآنِ مجید کی تعلیم کیلئے کوئی مؤثر کوشش نہ کی گئی تھی۔ لہٰذا اس فتنہ نے پھر سے اپنے پاؤں پھیلانے شروع کر دیے۔ بالآخر اس مرض کی صحیح تشخیص کی سعادت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) کے حصہ میں آئی۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کیلئے قرآنِ مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ شائع کرا دیا تاکہ عام طبقہ جو عربی زبان سے ناواقف ہے، ملکی زبان میں قرآن کی تعلیم سے آشنا ہو سکے[1] لیکن ہمارے احبار و رہبان جنہوں نے "ارباباً من دون اللہ" کا مقام حاصل کر لیا تھا، کی طرف سے اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ وہ ان کے درپے آزار ہو گئے اور ان پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ اس کے باوجود آپ نے ہمت نہ ہاری اور اسلامی تعلیمات سے متعلق نہایت قیمتی ذخیرہ فارسی زبان میں منتقل کر دیا۔ بعد ازاں آپ کے خاندان سے شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر صاحبان نے اردو زبان میں قرآنِ کریم کے تراجم پیش کیے جو آج تک بہ نظرِ استحسان دیکھے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی کوششوں سے بہت سے لوگ فیضیاب ہوئے اور قرآنی تعلیمات میں دلچسپی لینے لگے۔

انہی دنوں عرب میں شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے شرعی تعلیم کے نفاذ کیلئے بھرپور جدوجہد شروع کر رکھی تھی۔ کیونکہ وہاں بھی دینی تعلیم مفقود تھی اور لاتعداد آستانے وجود میں آ چکے تھے جہاں مشرکانہ رسوم ادا کی جاتی تھیں ——— شیخ موصوف کی اس تحریک کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور عرب کا علاقہ آہستہ آہستہ اس کے زیرِ نگیں آنے لگا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر وہاں کے احبار و رہبان حرکت میں آئے اور غیر شرعی حکومت میں شامل ہو کر شیخ مذکور پر کفر کا فتویٰ لگا دیا ——— آپ کی جماعت کو شیخ مذکور کے نام "محمد" کی نسبت سے محمدی کہنے کی بجائے حسد و بغض کی بنا پر وہابی کہنا شروع کیا اور یہ لفظ آہستہ آہستہ گالی اور طعن قرار پا گیا۔

بعینہٖ اسی دور میں ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پوتے شاہ اسماعیل شہید نے سید احمد بریلوی کی قیادت میں انہی مقاصد کی خاطر ایک تحریک چلائی جسے قبولِ عام حاصل ہوا اور

---

[1] ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا ترجمہ تھا جو ملکی زبان میں شائع ہوا۔

مجاہدین کی ایک جماعت تیار ہوگئی۔ گو اس جماعت کے قائدین سکھوں اور پٹھانوں کی ملی بھگت سے ۱۲۴۶ھ میں بالاکوٹ میں شہید ہو چکے تھے تاہم یہ جماعت بدستور کام کر رہی تھی اور انگریز کو اس جماعت سے سخت خطرہ لاحق تھا۔ لہٰذا یہاں بھی اس تحریک کو "وہابی" کی گالی سے نوازا جانے لگا۔

مزید برآں انگریز نے اس مشکل کا حل یہ سوچا کہ مسلمانوں میں انتشار و افتراق پیدا کر کے انہیں باہم دست و گریباں کر دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے انگریز بہادر کی نظرِ انتخاب دو آدمیوں پر پڑی۔

پہلی شخصیت مرزا غلام احمد قادیانی (متوفی ۱۳۲۶ھ) تھا۔ جس نے خود نبوت کا دعویٰ کر کے اپنی الگ امت تیار کی۔ یہ لوگ باقی تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے۔ انگریز کی نظرِ کرم اور عنایات کے باوجود اس جماعت کی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہو سکی۔ کیونکہ ختم نبوت کا عقیدہ ایسا عقیدہ تھا جو تمام دنیا کے مسلمانوں میں بالاتفاق پایا جاتا تھا۔

دوسری شخصیت احمد رضا خاں بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ) تھے۔ جو عاشقِ رسول بن کر سامنے آئے۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف کے نام پر ایسے عقائد کی بنا ڈالی جو اس سے پہلے تمام امتِ مسلمہ میں کبھی نہ پائے گئے تھے۔ مثلاً جس طرح اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے، اسی طرح حضور اکرمؐ بھی ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کو مکمل طور پر غیب کا علم ہے، ایسے ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہے فرق صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی ہے اور آپؐ کا عطائی ـــــ ذاتی اور عطائی "تقسیم" کے موجد آپ ہیں!

یا یہ کہ آپؐ بشر نہیں بلکہ نور تھے۔ نیز یہ کہ اہلِ قبور پکارنے والے کی پکار کو سنتے اور اس کی حاجت روائی کی استطاعت رکھتے ہیں ـــ چونکہ عشقِ رسولؐ کے نام پر یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا، لہٰذا جاہل عوام میں انہیں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔

نئے امام:

یہ لوگ چونکہ اہل سنت والجماعت کہلاتے اور فقہ حنفی کے مقلد ہونے کے دعویدار تھے۔ اور امام ابوحنیفہؒ ایسے مشرکانہ عقائد کے سخت دشمن تھے لہٰذا ان لوگوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ وہ صرف فقہی مسائل کی حد تک امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں، عقائد میں ان کے مقلد نہیں ہیں۔ یہ لوگ احمد رضا خاں بریلوی کی نسبت سے بریلوی حنفی کہلائے۔ اور اسی بنا پر انہیں امام اہل سنت

کہا جاتا ہے ——— اور جو حنفی اپنے دستورِ سابق پر قائم رہے وہ حنفی دیوبندی کہلائے!

انگریز کی چال بہت کامیاب رہی۔ دیوبندی اور بریلوی حضرات میں بحث مباحثے، مناظرے، سر پھٹول اور تکفیر بازی شروع ہو گئی۔ بریلوی حضرات جماعت اہل حدیث کو، جن میں سے اکثر شاہ اسماعیل شہید کی تحریک کے کارکن تھے، وہابی کہتے ہی تھے، اب دیوبندیوں کو بھی وہابی کہنا شروع کر دیا۔ گویا ہندوستان کے تقریباً تمام مسلمان تفرقہ بازی، انتشار اور آپ کی تکفیر کا نشانہ بن کر رہ گئے۔

تکفیر بازی:

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ آپ نے ۱۸۹۸ء میں ایک فتویٰ بعنوان "اعلام الاعلام بأنّ ہندوستان دار الاسلام" شائع کیا جس میں ہندوستان کو محض اس بنا پر دار الاسلام قرار دیا گیا تھا کہ یہاں مسلمانوں کو نجی طور پر نماز، روزے اور حسبِ شرع نکاح و طلاق کی اجازت ہے۔ اس فتویٰ سے انگریز کے سیاسی استحکام کو بہت تقویت پہنچی۔ مجاہدین نے ہندوستان کو دار الحرب سمجھ کر ہی تحریک شروع کی تھی۔ لہٰذا وہ سب کافر بلکہ یہودیوں سے بھی بدتر قرار دیئے گئے۔ تمہید ایمان اور حسام الحرمین میں تو اعلیٰ حضرت خاں صاحب گالی گلوچ پر اتر آئے چنانچہ صفحہ ۷۳ سے ۸۳ تک پورے دس صفحات پر مشتمل گالیوں کی ایک طویل فہرست مرتب کی ہے جو قابلِ دید ہے۔ "دوزخ کے کتے" آپ کا تکیہ کلام ہے۔ صفحہ ۱۲ پر مناظرانہ رنگ میں اُلو، گدھے اور سؤر تک مخالفین کو کہہ دیا۔ اور کئی جگہ وہابیوں کو واجب القتل قرار دیا۔ بلکہ یہاں تک لکھا کہ ایک وہابی کو قتل کرنا سو کافر کے قتل سے افضل ہے اور بادشاہ اسلام اس کا مجاز ہے۔

صفحہ ۶۸ پر لکھا:

"یہودی کا ذبیحہ حلال ہے اگر خدا کا نام لے کر کرے مگر وہابی دیوبندی کا ذبیحہ نجس اور مردار قطعی ہے اگرچہ لاکھ بار خدا کا نام لے، یہ سب مرتد ہیں!"

اس فتویٰ کی زد میں صرف تحریک مجاہدین کے وہابی ہی نہ آئے بلکہ انگریز کے خلاف تحریکِ آزادی کی جتنی بھی انجمنیں وجود میں آئیں، خواہ وہ مسلم لیگ ہو یا جمعیۃ العلمائے ہند یا مجلسِ احرار، ان سب انجمنوں کے لیڈروں اور ممبروں پر جناب احمد رضا خاں صاحب اور ان کے خاص معتقدین نے کفر کا فتویٰ لگایا اور ان سے تعاون حرام قرار دیا۔ حتیٰ کہ بانی پاکستان محمد علی جناح اور علامہ اقبال بھی نہ بچ سکے۔ بانی پاکستان کے متعلق فرمایا:

"بحکم شریعت مسٹر جینا (جناح) اپنے عقائد کفریہ قطعیہ یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے۔ جو شخص اسے مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے یا اس کے مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر!" (تجانب اہلسنت ص ۱۲۲)

علامہ اقبال پر تو پورے ۴ صفحے سیاہ کئے گئے، لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اقبال نے دہریت و الحاد کا زبردست پراپیگنڈہ کیا ہے" (تجانب ص ۳۴۰)

علامہ موصوف پر اس قدر برہمی کا باعث غالباً آپ کا یہ شعر بنا، جو آپ کے فتویٰ کے بالکل برعکس تھا ؎

ملاں کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

ڈاکٹر اقبال پر سب سے پہلے کفر کا فتویٰ مولوی دیدار علی شاہ والد ماجد سید ابوالبرکات احمد انجمن حزب الاحناف لاہور نے لگایا تھا۔

خواجہ حسن نظامی دہلوی، شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی بھی حضرت خان صاحب کے فتویٰ تکفیر سے نہ بچ سکے (تجانب ص ۱۲۲) حالی پر کفر کے فتویٰ کا سبب ان کے غالباً یہ اشعار تھے:

کرے غیر گربت کی پوجا تو کافر — جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر — کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں،
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں!

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں — اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں — شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

ناظرین مذکورہ بالا تفصیل اگرچہ ایک الگ موضوع ہے تاہم اس سے قبل نا یہ مقصود تھا کہ جناب خان صاحب نے اپنے فرقہ کے سوا باقی تمام مسلمانوں کو کافر اور گردن زدنی قرار دیا۔ سیاسی فرقوں کو اس لئے کہ وہ انگریز کے خلاف تحریک آزادی میں مشغول تھے۔ اور مذہبی فرقوں کو اس لئے کہ ان کے عقائد آپ کے عقائد سے ٹکراتے تھے۔

محبت کا معیار:

جب کوئی قوم اپنے نبی کی تعلیم اور اس پر عمل سے عاری ہو جاتی ہے تو وہ "پدرم سلطان بود" کے مصداق اپنے نبی کی شان کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا شروع کر دیتی ہے۔ یہی کچھ پہلی امتوں نے کیا اور یہی روش عاشقانِ رسول نے اختیار کی۔ اس فرقہ کے پیشوا "امام اہل سنت"، صرف عالم ہی نہ تھے شاعر بھی تھے۔ آپ کے نعتیہ کلام کے مجموعہ کا نام "حدائق بخشش" ہے۔ ان نعتوں میں آپ نے اکثر مقامات پر عبد اور معبود کے فرق کو یکسر ختم ہی کر دیا ہے مثلاً:

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب

یعنی محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا

یعنی حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چونکہ مالک (خدا) کے حبیب ہیں، تو بس انہیں بھی میں مالک ہی سمجھتا ہوں کیونکہ محبوب اور محب کی ملکیت (ملکوت السمٰوٰت والارض) مشترکہ ہی ہوتی ہے۔

گویا اب حبِ رسول کا معیار یہ ٹھہرا کہ جو کوئی شرک کی اس پر خار وادی میں جتنی زیادہ جولانی دکھائے، اتنا ہی زیادہ وہ محب اور عاشقِ رسول ہے۔ چنانچہ آپ کے محب اس میدان میں آپ سے بھی بازی لے گئے جس کی صدہا مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

افسوس، ان لوگوں نے حبِ رسولؐ کا معیار وہ قائم کیا جس سے آپؐ نے سختی سے منع فرمایا تھا۔ اس کے برعکس جو معیار خود آپؐ نے بتلایا ہے ذرا وہ بھی سنئے اور غور فرمائیے کہ دونوں میں کس قدر تضاد ہے:

"عن عبد اللہ بن مغفل، قال جاء رجل الی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فقال "انی احبک" قال "انظر ما ذا تقول؟" قال "انی احبک ثلاث مرات" قال "ان کنت صادقا فاعد للفقر تجفافا[1] للفقر اسرع الی من یحبنی من السیل الی منتہاہ" وفی روایۃ "ان الفقر الی من یحبنی منکم اسرع من السیل من اعلی الوادی"

"حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یا رسول اللہؐ میں آپ سے محبت رکھتا ہوں، آپؐ نے فرمایا، "سوچ لو جو کہہ رہے ہو؟" اس نے تین مرتبہ آپؐ سے محبت کے دعویٰ کو دوہرایا۔ آپؐ نے فرمایا "اچھا تو پھر

---

[1] تجفاف لوہے کے اس جھول کو کہتے ہیں جو لڑائی کے موقعہ پر گھوڑے کی حفاظت کیلئے اس کے اوپر ڈالا جاتا ہے۔

فقر اور اس کے ساتھ آنے والی تکلیفوں کیلئے تو ہے کا ایک جھول تیار کر لو، کیونکہ مجھ سے محبت رکھنے والے کی طرف فقر اس سے بھی زیادہ تیزی سے آتا ہے جیسے رکا ہوا پانی نشیب کی طرف جاتا ہے "

اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ تم میں سے جو مجھ سے محبت رکھتا ہے اس کی طرف فقر اس سے بھی زیادہ تیزی سے آتا ہے جیسے کہ وادی کی بلندی سے پانی نشیب کی طرف جاتا ہے "

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے محبت رکھنے والے صحابہ کرامؓ پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور جس حد تک کسی نے محبت کا دعویٰ کیا اسی حد تک وہ مزید متاثر ہوا۔ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے

"اشد البلاء علی الانبیاء ثم الامثل فالامثل"

کہ "سب سے زیادہ مصائب انبیاء پر نازل ہوتے ہیں، پھر ان کے ساتھیوں اور پھر ان کے ساتھیوں پر"

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان محبان رسولؐ پر کیا مصائب نازل ہوئے جنہوں نے جہاد کو یکسر موقوف کر کے عیش و آرام کو ترجیح دی اور کھانے پینے کی کئی بدعانہ رسومات کو شریعت کا درجہ دے دیا۔ تو کیا صرف زبانی محبت کا دم بھرنے، نبیؐ کی شان میں غلو کرنے، جشن عید میلاد النبی منانے اور جلوس نکالنے سے، جن میں سے ہر ایک فعل شریعت مطہرہ کے یکسر خلاف ہے، یہ لوگ نبیؐ کی محبت کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ اور اس سے زیادہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ انہیں قرآن و سنت کی تعلیم کس طرح راس آسکتی ہے؟

یہی وجہ ہے کہ امام اہل سنت نے "کنز الایمان" کے نام سے قرآن کریم کا ترجمہ کیا تو اس ترجمہ میں بریکٹوں میں ایسے الفاظ کا اضافہ کر دیا کہ عقل دنگ رہ جاتی اور انسان سر پیٹ کے رہ جاتا ہے۔ مثلاً آپ نے ہر مقام پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بشر کے بجائے نور اور عالم الغیب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر ان دو باتوں کو ہی درست تسلیم کر لیا جائے تو جہاں آپؐ کی بعثت کا مقصد ہی سرے سے فوت ہو جاتا ہے وہاں آپؐ کی ذات پر ایسے ایسے اعتراضات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ اگر تمام امت مسلمہ بھی ان اعتراضات کے جوابات سے عہدہ برآ ہونا چاہے تو کبھی نہ ہو سکے۔

بعض دفعہ ہمیں بریلوی علماء کے اس تعصب پر سخت افسوس آتا ہے کہ کبھی تو اس آیت "انما انا بشر مثلکم" کو وہابیوں والی آیت کہہ دیتے ہیں اور عموماً نماز میں ایسی آیات پڑھنے سے گریز کرتے ہیں اور کبھی "وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا" کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس آیت کی بس تلاوت ہی لازم ہے، اس کا ترجمہ نہیں ہے اور حقیقی مطلب اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے"

جہاں یہ صورتِ حال ہو تو کیا آپ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ یہ لوگ قرآنِ کریم کے ترجمہ کی طرف توجہ دینگے جبکہ اس طبقہ کو قرآن وسنت کی خالص تعلیم کی ضرورت ہی نہیں ہے ؟ ـــــ چنانچہ قرآن نافہمی کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب "عاشقانِ رسول" کا یہ رویہ ہے !

غیر مسلموں نے مسلمانوں کو کمزور کرنے اور انہیں اسلامی تعلیمات سے دور رکھنے کیلئے جو کچھ کیا، وہ ایک الگ داستان ہے ۔ یہاں ہم صرف ان اسباب کا جائزہ لے رہے ہیں جن کی وجہ سے گھر کو گھر ہی کے چراغ سے آگ لگ گئی ۔ بہر حال یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ قرآنی تعلیمات کی ترویج کے سلسلے میں ہمیں اغیار کی طرف سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا اپنوں نے پہنچایا ہے ۔ بقول شخصے ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہر چہ کرد آن آشنا کرد

کہ "میں بیگانوں کا رونا نہیں روتا، میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اپنوں ہی نے کیا ہے"۔

اور یہی وہ حقیقتِ ثابتہ ہے جس کی گواہی خدا کے حضور قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی دیں گے :

"وقال الرسول یٰرب ان قومی اتخذوا ھٰذا القرآن مھجورًا"

"اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرمائینگے کہ اے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا"

صحیح حل :

قرآنِ کریم محض اس لئے نازل نہیں ہوا تھا کہ اسے متبرک کتاب سمجھ کر ریشمی غلاف میں محفوظ کر کے بلند طاقوں پر سجا دیا جائے یا جھگڑے کی صورت میں بطور قسم سروں پر اٹھایا جائے ۔ یا تبرک کے طور پر کسی تقریب کا افتتاح کر لیا جائے ۔ نہ ہی یہ اس لئے نازل ہوا کہ حروف، آیات اور کلمات کی صحیح صحیح گنتی کی جائے ۔ یا اسے اعلیٰ کاغذ پر خوشنما کر کے طبع کر دیا جائے ۔ بلکہ یہ کتاب ہماری ہدایت کے لئے نازل ہوئی تھی کہ اسے سمجھا جائے ، اس میں تدبر کیا جائے اور اس کی ہدایات اور احکام پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی کو سنوارا جائے اور اسلام کی سربلندی کیلئے کوشش کی جائے ۔

لہٰذا ہمارے خیال میں اس کی بہترین صورت وہی ہے جس کی طرف ہم آغاز میں اشارہ کر چکے ہیں کہ بچے کو ابتدا ہی سے قرآنی الفاظ کے معانی سے بھی روشناس کرایا جائے نیچے بالکل ابتدائی

تعلیم مسجدوں اور گھروں میں حاصل کرتے ہیں - اسی بنیاد سے یہ عمارت کھڑی ہونی چاہیئے - اور مدارسِ عربیہ میں تو لازماً پہلے ہی سال صرف ونحو کے ساتھ ساتھ ترجمہ قرآن بھی سرسری طور پر ختم کیا جانا چاہیئے - تاکہ اگر کوئی طالب علم مدرسہ کا کورس پورا نہیں کر پاتا تو کم از کم قرآنِ کریم کے ترجمہ سے تو روشناس ہو - چنانچہ اسی نظریہ کے تحت راقم الحروف نے بچوں کو ابتدا ہی سے ترجمہ پڑھانے کا تجربہ گھر سے شروع کیا ہے جس کے نتائج نہایت حوصلہ افزا ثابت ہوئے ہیں اور اسی بنا پر ہم یہ بات نہایت وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اونچی سطح پر بھی یہ تجربہ انشاء اللہ نہایت کامیاب ثابت ہوگا -

ہمارا پروگرام :

حفظ کرنے والے بچوں کو اگر ترجمہ بھی پڑھا دیا جائے تو انہیں حفظ کرنے میں بھی سہولت رہتی ہے - ہم نے دیکھا ہے کہ ترجمہ پڑھنے سے بچے بھی خوش ہوتے ہیں اور ان کے والدین بھی - بچے جب اپنے گھروں میں جاکر والدین کو اپنے سبق کا ترجمہ بھی سناتے ہیں تو وہ باغ باغ ہو جاتے ہیں - مدرسہ میں نظم وضبط پیدا کرنے کیلئے ہم نے یہ التزام کیا ہے کہ جو بچہ کلاس سے غیر حاضر ہوگا اسے پچاس پیسے یومیہ جرمانہ ہوگا - فیس مطلقاً نہیں ہے - بچے اولاً تو بہت کم غیر حاضری کرتے ہیں اور اگر غیر حاضری ہو جائے تو جرمانہ کی رقم بخوشی ادا کر دیتے ہیں اور یہ ترجمہ سے ان کی انتہائی دلچسپی کا نتیجہ ہے - اندریں صورت سب دوستوں سے گزارش ہے کہ وہ اس بے حد اہم کام کی طرف فوری توجہ دیں اور ناظرہ قرآنِ کریم پڑھانے کے ساتھ ساتھ بچوں کو ترجمہ سکھانے کا بھی التزام کریں -

بازار سے جو ابتدائی قاعدے دستیاب ہوتے ہیں، ان میں بعض الفاظ مہمل بھی ہوتے ہیں اور بعض الفاظ معانی کے لحاظ سے دقیق بھی - لہٰذا ہم ایک ایسا قاعدہ مرتب کرنا چاہتے ہیں جس میں تقریباً تمام الفاظ قرآنی ہوں اور بامعنی بھی ہوں - اس قاعدہ میں یہ التزام بھی رکھا گیا ہے کہ کسی جاندار کی تصویر قاعدہ میں شائع نہ کی جائے - قاعدہ کی ضخامت ۲۴ چھوٹے صفحات سے زیادہ نہ ہو اور قیمت بھی پچاس پیسے سے بڑھنے نہ پائے - اگر یہ قاعدہ حسبِ خواہش زیورِ طباعت سے مزین ہو گیا تو ابتدا ہی سے عربی الفاظ کا ترجمہ پڑھانے کی طرف یہ ایک اہم قدم ہوگا -

آخر میں ہم قارئین سے اس پروگرام کی تکمیل میں کامیابی کی دعا کی درخواست کے ساتھ ساتھ یہ اپیل بھی کریں گے کہ وہ اس اہم ترین فریضہ کی انجام دہی میں ہر ممکن تعاون کریں جس کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہر حلقہ میں، ہر سطح پر اس پروگرام کو فروغ دیں اور قرآنی تعلیمات کی ترویج کے سلسلہ میں اپنے فرائض سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہو کر عند اللہ ماجور ہوں ـــــ گر قبول افتد زہے عز و شرف!